نظیر اکبرآبادی کی شاعری

اعلم شمس
اسسٹنٹ پروفیسر، ذاکر حسین دہلی کالج،
دہلی یونیورسٹی

نظیر دہلی میں 1735 میں پیدا ہوئے اور نادر شاہ کے حملے کے وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی نانی کے یہاں آگرہ آ گئے تھے۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز، مخمور اکبرآبادی، مولانا عبدالباری، مولانا اشرف لکھنوی، فرحت اللہ بیگ، پروفیسر محمد حسن اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ نظیر اپنی ماں کے ساتھ 23-22 سال کی عمر میں آگرہ آئے جب کہ یہ غلط ہے۔ قطب الدین باطن جو نظیر کے شاگرد تھے، انھوں نے اپنے تذکرہ 'گلستانِ بے خزاں' میں لکھا ہے کہ نظیر صغر سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ گئے۔ باطن کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ نظیر کے شاگرد تھے پھر اگر نظیر جوانی میں دلّی چھوڑتے تو ان کی شاعری میں دلّی کی زبان، دلّی کے حالات کچھ تو ان کی شاعری میں ہوتا کیوں کہ بچپن کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں۔

نظیر آگرے میں نوری دروازے میں رہتے تھے۔ گلزار علی اور امامی بیگم دو بچے تھے۔ نظیر کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ نظیر نے اپنی جوانی میں زندگی کے عیش و آرام، تفریح اور مذاق سب میں حصہ لیا تھا۔ کھیل کود، کنکوئے بازی، تیراکی، کثرت، کشتی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، غرض کہ ہر طرح کا مزا لیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہواروں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ بڑے بڑے دعوت نامے انھیں آگرے سے دور نہ لے جا سکے۔ انھیں آگرے سے عشق ہو گیا تھا۔ یہاں کی ہوا میں رادھا اور کرشن کی محبت اور بھگتی کے گیت گونج رہے تھے۔ وہ ایک بند میں آگرے سے لگاؤ کو یوں بیان کرتے ہیں:

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملاّ کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

فرحت اللہ بیگ نے 'دیوانِ نظیر' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ: ''طبیعت میں استغنا بہت تھا۔ واجد علی شاہ نے بلایا، نہیں گئے۔ محمد حسن نے بھی واجد علی شاہ کے بلانے کی بات کہی ہے جب کہ یہ بات غلط ہے کیوں کہ واجد علی شاہ 1846 میں نواب بنے اور نظیر کا انتقال 1830 میں ہو گیا تھا۔ نظیر نے ایک طویل عمر پائی۔ انھوں نے آرام بھی اٹھایا اور زندگی کے دکھ بھی سہے۔ انھوں نے عشق و محبت کی بازیاں بھی لڑیں اور خانقاہوں کا رخ بھی کیا۔ آگرے میں لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ 1830 میں نظیر کا انتقال ہوا اور وہ جس نیم اور بیری کے پیڑ کے نیچے بیٹھتے تھے وہیں ان کی قبر بنی۔ نظیر کی خدا پرستی کے سبب ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے انھیں بڑا صوفی فقیر سمجھا اور وہ ان کی قبر پر ہر سال میلہ لگانے لگے۔

نظیر کو درباروں سے کوئی واسطہ نہ تھا جس کے سبب ان کے کلام میں وہ رنگ نہیں پایا جاتا جو دربار سے متعلق شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ درباروں سے نہ جڑنے کی وجہ ان کی سادگی تھی۔ عوام سے ان کی دلچسپی تھی، ان کی شاعری عوام کی زبان میں عوام کے لیے عوام کی جگہ سے پیدا ہوتی تھی۔ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعر کہتے وقت کبھی خواص کے ذوق اور ان کی پسندیدگی پر واہ نہ کی۔ وہ شعر کہتے تو اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے یا عوام کی فرمائش پر۔ نظیر بازار میں کھڑے ہیں، لڈو بیچنے والے نے لڈو پر شعر لکھوائے تو ککڑی بیچنے والے نے ککڑی پر شعر لکھوائے تو ریچھ کا تماشا دکھانے والے نے ریچھ کے پنجے پر نظم لکھوالی۔ نظیر عوام کے دکھ درد کا شاعر ہے، اسے اونچے محلوں اور قلعوں سے کوئی لینا دینا نہیں، اسے آگرے سے اور آگرہ باسیوں سے پیار تھا۔ وہ جمنا کی لہروں اور براندابن کی فضاؤں سے محبت کرتا تھا اور اس کے اسی عوام کی شاعری کے لگاؤ کی وجہ سے اردو تنقید میں بے توجہی کا شکار ہونا پڑا۔ ناقدوں اور تذکرہ نگاروں نے عموماً نظیر کو ناپسند کیا۔ اگر ان کا ذکر کیا بھی تو سطحی طور پر۔ اردو کے ابتدائی تذکروں نکات الشعرا، مخزنِ نکات

اور تذکرۂ شعرا میں نظیؔر کا ذکر نہیں ملتا۔ بعد کے تذکروں میں ذکر ملتا ہے۔ شیفتہؔ نے اپنے تذکرے میں نظیؔر کو بازاری شاعر بتایا۔ نظیؔر کے شاگرد قطب الدین باطنؔ نے اپنے تذکرے 'گلستانِ بے خزاں' میں شیفتہؔ کو منہ توڑ جواب دیا۔ نظیؔر پر سب سے اہم نظر پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ڈالی۔ انھوں نے نظیؔر پر اپنی کتاب ''زندگانیِ بے نظیر'' لکھ کر بے نظیر بنا دیا۔

نظیؔر عوامی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ وہ خود بھی عوامی زندگی کے ہنگاموں، عوام کے ہنسی قہقہوں کے سکھ دکھ، ان کے کھیل تماشوں اور تفریحات میں برابر کے شریک ہیں۔ اگرچہ دورِ مغلیہ کے عہدِ زوال کے شاعر تھے لیکن چوں کہ وہ قدرتاً رجائی یعنی Optimistic انسان تھے۔ حالات کی تباہی و بربادی کو وہ دوسرے نظریے سے دیکھتے تھے۔ وہ دنیا سے دل ہٹانے کی بات کرتے تھے اور کہتے تھے یہ سب مال و دولت اور حکومت جانے والی چیزیں ہیں، اس کا دکھ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے نظم 'بنجارہ نامہ' لکھی۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ اور عام آدمی کے درد کو کم کرنے کے لیے انھوں نے 'آدمی نامہ' لکھی۔ دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی۔ زندگی اور عوام سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کی زبان بھی وہی ہے جو اس زمانے کے اکبرآباد کے عوام کی زبان تھی۔ نظیؔر کے یہاں الفاظ کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ نظیؔر بہت بڑا حقیقت نگار ہے، وہ زندگی کے ہر رُخ کو نہایت ہی صداقت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔

نظیؔر نے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مخمس، مسدس، مثمن، معشر، قطعہ بند، ترکیب بند، ترجیع بند، بحرِ طویل اور تضمین بر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظیؔر نظم کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، ان کا بڑا مشہور شعر ہے:

صحرا میں میرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا

ان کا زمانہ اردو شاعری میں غزل کے شباب کا زمانہ ہے۔ میرؔ کے آخری دور سے لکھنؤ کے ابتدائی دور تک چند مثنویوں اور قصیدوں کو چھوڑ کر اردو شعرا کا سرمایۂ کمال غزلیں ہیں۔ حالاں کہ

نظیر نے غزل کی بادشاہت کو چیلنج کرتے ہوئے نظم نگاری کا جھنڈا گاڑا اور ترقی پسند نظریے کی بنیاد رکھی۔ چوں کہ غزل اشراف اور دربار کی نمائندگی کرتی تھی جب کہ نظیر عوام کے شاعر تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیر نے بلا امتیازِ مذہب وملّت جس طرح سے میلوں ٹھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ ان کی سیکولر طرز کا غماز ہے۔ نظیر صرف نظریات تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے عملی زندگی میں تجربے کی بھٹی میں سلگ کر نفرت وحسد کی رنگ کو صاف کیا۔ نظیر کے زمانے کے حالات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو نفرت وبُغض کی گھاٹیوں سے نکال کر مساوات، بھائی چارگی اور رواداری کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ صوفیوں کی خانقاہوں میں ہندوؤں اور سنتوں کے استھان پر مسلمانوں کے ہجوم لگنے لگے۔ نظیر نے ان حالات کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ پروفیسر شہباز کے بقول فقرا کے تکیے پر سریع الاعتقادی اور عجائب پرستی نے ان دنوں ہندوؤں کا بھی ایک بڑا بھاری میلہ لگا رکھا تھا یہی حالات جوگیوں اور سنیاسیوں کے استھانوں میں مسلمانوں کا تھا۔ اسلام اور کفر دونوں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ شیخ وبرہمن نے آپس میں صلح کر لی تھی۔

نظیر کو ہر طرف وحدۃ الوجود کے جلوے نظر آتے تھے۔ وہ ہر ذرّے میں خدا کا جلوہ مانتا تھا یعنی ہر میں ہری اس کا فلسفہ تھا، اسی لیے مہادیو، کرشن جی وغیرہ اس کے نزدیک لائق احترام تھے۔ نظیر اصل میں کبیر اور گرونانک کے عقیدے کا آدمی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو زیادتی کا شکار مانتا تھا۔ نظیر دراصل صلحِ کل کا جویا تھا یعنی سب کو گلے لگانے والا، اس کے نزدیک آدمی آدمی سب برابر تھے اسی لیے نظیر عداوت کا دشمن تھا۔ مذہب کے فرق سے انسانیت میں فرق کرنے کا وہ مخالف تھا، اس کے نزدیک جس کو ہندو اوتار کہتے ہیں اس کو مسلمان پیغمبر کہتے ہیں۔ نظیر کی ایک حمد کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہوگا جس میں انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ سب کا معبود ایک ہی ہے، اسے چاہے جس نام سے پکارو:

کوئی خالق، باری، رب، مولا، رحمان، رحیم، اللہ، تنگری
کوئی الکھ روپ کرتار کہے، نرنکار، نرنجن، نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سجدے، کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچا ہے

نظیر کو دیر وحرم میں کوئی زیادہ فاصلہ نظر نہیں آتا۔ قرآن اور پوتھی دونوں کو وہ ایک ہی

جزدوان میں رکھتے ہیں۔ وہ صوفی کو جوگی اور اور زاہد کو بھوگی سے گلے ملتے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تسبیح اور سمرن دونوں ایک ہی ہاتھ سے پھیری جاتی ہے۔ وہ کنٹھے اور سنگھ سے بھی اذان کی آواز سنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار
کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سا چار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار
بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی خوار
زخمی کوئی ماندہ کوئی اچھا کوئی بدکار
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

رام بابو سکسینہ کے بقول نظیر **الوحدۃ فی الکثرۃ** کے دل سے قائل اور با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں ان سے دلی محبت رکھتے اور ان کو اپنا شیدا اور گرو سمجھتے تھے۔ صوفی ازم اور بھگتی ازم دونوں کی دھاراؤں نے نظیر کی زندگی کے چشمے کو سیکولرزم کی موجوں سے لبریز کر دیا تھا۔

نظیر نے تمام مذاہب کے یکساں احترام کی سیکولر اسپرٹ کو اپنے کلام میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی مکمل آئینہ دار ہے۔ ایک دیندار مسلمان ہونے کے باوجود وہ جس عقیدت سے پیغمبر کے نواسوں اور داماد کے معجزات کو نظم کر سکتا ہے وہ اس عقیدت سے گرونانک، بلدیو اور کرشن چندر جی کے بھی گن گاتا ہے۔ نظیر کی نظمیں سیکولر خیالات اور رجحان کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں بے تعصبی، مذہبی رواداری اور تمام مذاہب کے یکساں احترام کی اسپرٹ پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

نظیر نے ہر ہندستانی تیوہار کو اپنا تیوہار اور ہر مذہبی پیشوا کو اپنا رہنما سمجھا۔ دیوالی، ہولی، راکھی، عید، شبِ برات، کنہیا جی کا جنم، بانسری، ہولی کی بہار، برسات کی بہاریں وغیرہ نظمیں شاعر کی حب الوطنی، وسیع النظری، بے تعصبی، انسان دوستی اور خلاقانہ شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ نظیر نے

جو نظمیں ہندو تیوہاروں اور غیر مسلم رہنماؤں پر لکھی ہیں۔ وہ فکر وفن کے اعتبار سے اسلامی نظموں سے کہیں زیادہ موثر اور دلپذیر ہیں۔ ان میں نظیؔر کا فن نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ ان نظموں میں نظیؔر نے جو جانکاری دی ہے وہ بڑے بڑے پنڈت کے بس کی بات نہیں ہے۔

اردو ادب میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جہاں مسلمان شاعروں نے ہندو دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کی مدح کی ہے اور ہندو شعرا نے حمد، نعمت اور منقبت لکھی ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں جذبے کی صداقت واحترام اور عقیدت اسی طرح کارفرما ہے جس طرح اس مذہب کے ماننے والوں کے دل میں ہوتی ہے۔ ہندو اوتاروں کی شان میں مسلمان شعرا نے یا پیغمبرِ اسلام کی شان میں ہندو شعرا نے جو کچھ لکھا ہے اسے اگر جمع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں اور یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ اگر ان کے لکھنے والوں کے نام ظاہر نہ کیے جائیں تو یہ بتانا مشکل ہوگا کہ ان نظموں کا لکھنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ کنور مہندی سنگھ بیدی کا شعر ہے کہ:

عشق ہوجائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

اردو کے تمام شعرا کے یہاں تمام مذاہب کا یکساں احترام یا مذہبی رواداری نظر آتی ہے لیکن نظیؔر اکبرآبادی نے اردو شاعری کے دھارے کو جس طور سے گنگا جمنی دھارے میں تبدیل کردیا ہے اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

نظیؔر کا وطن آگرہ صدیوں سے خاص تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اس تہذیب کو مغل شہنشاہ اکبر نے بامِ عروج پر پہنچادیا تھا۔ اس سے پہلے ولبھاچاریہ کی قیادت میں بھکتی تحریک براندبن، متھرا اور آگرہ کے علاقے میں چپّے چپّے پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھی۔ برج کا یہ علاقہ اپنی مقامی بولی برج بھاشا کی رنگینی، جاذبیت، لطافت اور اسلوبِ بیان کی سادگی کی وجہ سے یکا یک شمالی ہند پر چھا گیا اور شاید برج بھاشا کی اسی خوبی نے محمد حسین آزاد کو یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ بہرحال نظیؔر کی پرورش اسی تہذیبی ماحول میں ہوئی۔ نظیؔر نے آگرے میں ہونے والے ہر قسم اور ہر مذاہب کے تہواروں میں بھرپور حصہ لیا اور تقریباً ایک صدی کی عمر تو رنگ ونسل، قوم وقبیلے اور مذہب وملّت، امیر وغریب کے اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے انسانوں سے محبت کرنے میں صرف کردیا۔

اردو مثنویوں میں جو سیکولرزم دیکھنے کو ملتا ہے کہ مسلم بادشاہ ہے لیکن نجومی اور پنڈتوں کی پوتھیوں پر یقین رکھتا ہے۔ وہ مثنوی کے کردار کی مجبوری ہوتی ہے لیکن نظیر نے نظم میں جس سیکولر انداز کو اپنایا ہے وہ کردار کی مجبوری نہیں بلکہ عقیدت اور دل کی گہرائی ہے۔

نظیر نے سیکولر اسپرٹ کے تحت تین طرح کی نظمیں لکھی ہیں:

(1) بین المذہبی شخصیتوں اور رہنماؤں کی شان میں

(2) بین المذہبی تہواروں پر

(3) تہواروں کے موقعے پر لگنے والے میلوں ٹھیلوں پر

پہلی قسم میں اسلام اور ہندو اور سکھ مذہب کے رہنماؤں پر نظمیں لکھی ہیں۔ سکھ مذہب پر صرف ایک نظم ہے جو انھوں نے گرو نانک جی پر لکھی ہے:

ہیں کتنے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی بر لائے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب شیس نوا اور اَرداس کرو ہر دم بولو واہ گرو

نظیر چوں کہ مسلمان ہیں لہٰذا ان کی اسلامی شخصیتوں پر لکھی گئی نظمیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندو مذہب کے اوتاروں اور رہنماؤں پر نظیر نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ نظمیں شری کرشن جی پر لکھی ہیں۔ درگا جی، بھیروں جی، مہادیو جی اور بلدیو جی پر بھی نظمیں لکھ کر مذہبی رواداری اور سیکولر ہونے کا واضح ثبوت دیا ہے۔ کرشن جی پر زیادہ نظمیں لکھنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ برندابن، متھرا اور آگرے کے علاقے میں کرشن بھکتی ذرّے ذرّے میں سمائی ہوئی تھی جس کو نظیر نے اندر تک محسوس کیا اور پھر ان کی عقیدت کے تار میں جھنکار پیدا ہوئی۔ اگر سری کرشن سے متعلق نظیر کی تمام نظموں کو جمع کر دیا جائے تو سری کرشن کی اچھی خاصی سوانح (Biography) تیار ہو جائے گی۔

حوالہ:

۱-شمس الحق عثمانی: نظیر نامہ، صبوحی پبلی کیشنز، دہلی، 1979
۲-عبدالباری آسی: کلیاتِ نظیر اکبرآبادی، رام کمار پریس وارث نول کشور، لکھنؤ، 1951
۳-علی احمد فاطمی: نظیر اکبرآبادی، نصرت پبلی کیشنز، لکھنؤ، 1983
۴-محمد حسن: نظیر اکبرآبادی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1994
۵-مرزا فرحت اللہ بیگ: دیوانِ نظیر اکبرآبادی، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 1924